SHNAKHAT E(ISSN) 2709-7641, P(ISSN) 2709-7633
Vol:3, ISSUE:3 (2024) PAGE NO: 48-57
Publishers: Nobel Institute for New Generation
http://shnakhat.com/index.php/shnakhat/index

Cite us here: ڈاکٹر محمد ریاض عابد,& فوزیہ ناز.(2024).طاہرہ اقبال کے ناول ''گراں'' کا تانیثی مطالعہ. Shnakhat, 3(3). Retrieved from https://shnakhat.com/index.php/shnakhat/article/view/319

"طاہرہ اقبال کے ناول ''گراں'' کا تانیثی مطالعہ"

ڈاکٹر محمد ریاض عابد[1] فوزیہ ناز [2]

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو واقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول نگر کیمپس [2]فوزیہ ناز
شعبہ تعلیم، حکومت پنجاب

Abstract

A man and a woman have two wheels life Vehicle. Both of them have responsibilities. If both of them fulfill their responsibilities well, life becomes very easy and beautiful. The novel **Graan** also has the same story. Where earlier women were respected to the extent of worshipping men. Men would marry and leave, and they would spend ages waiting for them. But later when they came into new era and got education, they also started talking about their rights. They demanded that they be treated equally. In this novel, although Ghazal Jan revolted from the traditions, she still suffered from the oppression of Samaj.This shows that changing this society is not a matter of Ghazal-Jaan alone, but everyone has to make efforts together.

Key Words: Novel, Tahira Iqbal, Feminism, literature

ایک ملک میں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد ہوتے ہیں۔ان لوگوں کی زبان مختلف ہوتی ہے، رہن سہن کے انداز مختلف ہوتے ہیں اور رسوم و رواج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ تمام لوگ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں لیکن اپنے رسوم و رواج اور ثقافت پر ہی عمل پیرا رہتے ہیں۔انہیں تہذیبوں سے وابستہ افراد کے مل جل کر رہنے سے ہی ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

کسی بھی علاقے کی تہذیب اور ثقافت بالواسطہ یا بلاواسطہ وہاں تخلیق ہونے والے ادب کو متاثر کرتی ہیں۔اس کے علاوہ سماجی رویوں سے بھی ادب متاثر ہوتا ہے اگر میں یہ کہوں کہ ادب اور سماج کا رشتہ ایک ناگزیر حقیقت ہے تو شائد غلط نہ ہوگا۔ایک ادیب جہاں زمانے کے تغیر و تبدل سے متاثر ہوتا ہے وہاں عالمی سطح پر آنے والی تبدیلیوں اور تحریکوں سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ایک ادیب ایسا ادب تخلیق کرتا ہے جس میں وہ معاشرے میں ہونے والی ناہمواریوں اور زیادتیوں کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کا مقصد ایسا معاشرہ تخلیق کرنا ہوتا ہے جس میں امن اور مساوات ہو۔ ماضی کے

جھروکوں میں جھانک کر دیکھیں تو جہاں ہمیں طبقاتی اونچ نیچ کے مسائل دکھائی دیتے ہیں وہاں عورتوں پر مرد کا غلبہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ زمانہ قدیم میں عورتوں کے ساتھ بڑا نارواسلوک روا رکھا گیا۔ گھر اور باہر کے تمام معاملات میں مرد کا حکم چلتا تھا اور عورتوں میں زباں بندی کی رسم قانون کی طرح نافذ تھی۔ معاشرے میں عورت کو کوئی حیثیت حاصل نہ تھی، علم کے دروازے اُس پر بند تھے، مذہبی رسومات کی پابندی لازمی تھی لیکن مذہبی علوم سے اسے بے بہرہ رکھا جاتا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ پابندیاں کچھ نرم ہوئیں تو عورتوں پر تعلیم کے دروازے کھل گئے جس سے ان میں شعور آیا تو انہیں بھی اپنے حقوق اور فرائض سے آگہی ہوئی اور عورت یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ آخر اس کی ذات ہی کیوں ہر جگہ مرد کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ ماں، بہن، بیٹی، بیوی، داشتہ، وحشیا، رکھیل، رنڈی ہر رشتہ مرد کا ہی دیا ہوا ہے۔ مرد کی مرضی چاہے تقدس عطا کر دے چاہے حقیر القابات سے نواز دے۔

میری فرگوسن نے کہا تھا:

> ''مرد کو تو پوری دنیا، فطرت، سماج، حتیٰ کہ خدا کے رشتے کی رو سے پیش کیا گیا، مگر عورت کا تصور مرد کے ساتھ تعلق کی رو سے کیا گیا ہے۔''[1]

آخر کار انیسویں صدی کے اوائل میں خواتین کے سیاسی اور سماجی حقوق کی بازیافت کے لیے تحریک شروع ہوئی۔ یہ تحریک یورپ کی دین ہے اور اس دور کے مخصوص سیاسی اور سماجی حالات کے نتیجے کے طور پر سامنے آئی۔ ۱۷۹۱ء میں فرانس کی اسمبلی میں چارلس موریس نے صنفی بھید بھاؤ پر مبنی ایک تعلیمی خاکہ پیش کیا۔ اس میں انہوں نے عام تعلیم کو صرف مردوں کے لیے ضروری قرار دیا اور خواتین کے لیے صرف بنیادی گھریلو تعلیم کو ضروری قرار دیا۔ اس تجویز کے جواز کے لیے دلیل یہ دی گئی کہ مرد کو دنیا سنبھالنی ہے اس لیے مرد کو اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے جبکہ عورتوں کو تو صرف گھر گرہستی ہی سنبھالنی ہے اس لیے ان کے لیے گھریلو اور بنیادی تعلیم ہی کافی ہو گی۔ فرانس میں ہی مقیم ایک برطانوی خاتون میری وال سٹون کرافٹ نے چارلس موریس کی اس رپورٹ کے جواب میں A vindication of the Rights of Women کے عنوان سے ایک پمفلٹ لکھا جو ۱۷۹۲ء میں شائع ہوا۔ اس پمفلٹ میں انہوں نے عورتوں کو تعلیم کا حق دیئے جانے کی وکالت کی۔ اس نے کہا کہ عورت صرف ایک مرد کی بیوی نہیں ہوتی بلکہ ملک اور سماج کا لازمی حصہ بھی ہوتی ہے۔ عورت کو معاشرے کا قیمتی زیور اور شادی کے نام پر بیچ دی جانے جائیداد کی بجائے انسان سمجھنا چاہیے۔ بحیثیت انسان اسے ان کے تمام بنیادی حقوق ملنے چاہیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق پر اصرار پر بھی اصرار کیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو تانیثی نکتہ نظر سے یہ احتجاج کی پہلی معتبر آواز تھی۔ اس آواز کو فرانس کی سیمون دی بوآر کی (دی سیکنڈ سیکس) نے تقویت بخشی اور تانیثیت نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ انہوں نے بھی عورتوں کے لیے برابری کے حقوق کا مطالبہ کیا۔ اُن کی یہ آواز صرف فرانس میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں سُنی گئی اور اس کے دنیا بھر کے ادیبوں اور شاعروں کو اس حوالے سے سوچنے پر مجبور کر دیا اور دنیا بھر کے زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا بھر میں عورتوں کے متعلق ایک نئی بحث چھڑ گئی اور تحریروں کے ایک بحر بے کراں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لفظ تانیثیت کے معنی و مفہوم پر غور کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ تانیثیت (Feminism) ایک جدید اصلاح ہے۔ یہ لاطینی زبان کے لفظ ''Femina'' سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی، نسوانی آواز رکھنا، کے ہیں۔'' Feminism'' کا لفظ کب اور کیسے استعمال کیا گیا اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے تو

قائم نہیں کی جا سکتی تاہم ایک عام رائے ہے کہ اس کا سب سے پہلا استعمال فرنچ میڈیکل ٹیکسٹ میں ۱۸۷۱ء میں کیا گیا۔ ابتدائی طور پر اس لفظ کا استعمال ایسے لوگوں کے لیے کیا جاتا رہا جن میں کسی وجہ کوئی نسوانی اوصاف پائے جاتے تھے۔

فرانس کی ہی ایک خاتون نے ''Alexander Dumas Fils '' نے Feminist کا استعمال ایسی خواتین کے لیے کیا جو بے باک اور بہادر مزاج رکھتی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے معنی و مفہوم میں بدلاؤ آیا اور اس کا استعمال اُن لوگوں کے لیے کیا جانے لگا جو ''حقوق نسواں'' کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ یوں آہستہ آہستہ اس رجحان نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ بقول انیس ہارون:

''خواتین پر ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھانا ان کے حقوق کی بات کرنا فیمینزم ہے۔''[۲]

اس تحریک کے اثرات برصغیر تک بھی پہنچے اور اردو ادب کو بھی متاثر کیا۔ اردو ادب میں عورتوں کی اصلاح کا کام تو سرسید، ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار اور علامہ راشد الخیری کے دور سے ہی ہو جاتا ہے۔ انہوں نے بھی اپنی تحریروں میں عورت کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ مولانا حالی کی **چپ کی داد، مناجات بیوہ، مجالس النساء**، علامہ راشد الخیری کی **نوحہ زندگی**، نذیر احمد کی **مراۃ العروس ، بنات النعش** میں اس دور میں عورتوں پر ہونے والے ظُلم کے خلاف احتجاجی آواز اٹھائی۔ اُردو میں تانیثی تحریک باقاعدہ طور پر انیسویں صدی کی آخری دہائی میں زور پکڑا۔ اس کے بعد مرزا ہادی رسوا، اور پریم چند کے علاوہ کئی خواتین لکھاری بھی میدان میں آئیں جنہوں نے خواتین میں شعوری بیداری اور حقوق سے آشنائی کے لیے آواز اٹھائی۔ اُردو فکشن میں تانیثیت کا باقاعدہ آغاز ''انگارے'' کی اشاعت سے ہوا۔ ''انگارے'' میں شائع ہونے والے افسانوں میں عورتوں پر ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف آواز اُٹھائی گئی۔ انگارے کی اشاعت نے ہی اِس تحریک کو مقبولیت بخشی۔ اُس دور میں سب سے پہلے جس عورت نے خواتین کے حقوق کے لیے آواز اُٹھائی وہ ڈاکٹر رشید جہاں ہیں۔ اِن کے بعد عورت کے حقوق کے لیے آواز اُٹھانے والوں میں عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، خدیجہ مستور، قراۃ العین حیدر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

برصغیر میں جب عورتوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز اُٹھائی تو اُن پر طرح طرح کے الزام لگائے گئے ان کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ انہیں مغرب زدہ کہا گیا، معاشرے کا باغی قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ اپنی حد سے تجاوز کرنے لگی ہیں۔ اس تحریک کی راہ میں حائل رکاوٹوں کی نشاندہی کرتے ہوئے عقیلہ جاوید لکھتی ہیں:

''درحقیقت ہمارے معاشرے میں عورتوں پر تین طرف سے حملہ ہوتا ہے۔ اوّل قانون، دوم رسم و رواج اور غربت و جاہلیت۔''[۳]

ڈاکٹر طاہرہ اقبال گورنمنٹ کالج فار ویمن یونیورسٹی میں بطور صدر شعبہ اُردو خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ اس ناول میں وہ موجودہ دور میں تحریک نسواں کی علمبردار بن کر سامنے آئی ہیں۔ اُن کا ناول ''گراں'' اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ طاہرہ اقبال دھیمے لہجے کی ایک پختہ کار ناول نگار ہیں۔ اس کے علاوہ ان تک اُن کے چار افسانوی مجموعوں (سنگ بستہ، ریخت، گنجی بار اور زمیں رنگ) کے علاوہ دو ناول ''نیلی بار'' اور ''گراں'' شائع ہو چکے ہیں۔ ''مٹی کی سانجھ'' کے عنوان کے عنوان سے اُن کے دو ناولٹ بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ طاہرہ اقبال کا ناول ''گراں'' دراصل پوٹھوہاری تہذیب کی شکست و ریخت کا نوحہ ہے۔ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ ہونے والی ترقی کا ذکر ہے جس نے پوٹھوہار کے لوگوں سے اُن کی حقیقی پہچان چھین لی۔ ناول

چار حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ ''چوا پاک'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے جو تقسیم ہند کے فوراً بعد کے حالات بیان کرتا ہے، دوسرا حصہ ''تاج محل'' کے عنوان سے ہے جس میں پوٹھوہار کی بدلتی ہوئی تہذیب اور نئی اقدار کے پھوٹنے کی وضاحت کی گئی ہے، تیسرا حصہ ''چودھری محمد اکرم'' NZD Vs کے عنوان کے لکھا گیا ہے جس میں دو دوستوں کی زندگی کو موضوع بنا کر جدید تہذیب اور دیہی تہذیب کا موازنہ کیا گیا ہے جبکہ چوتھا حصہ ''میری کالی مرغی کھو گئی'' کے عنوان سے ہے جس میں مشرق وسطیٰ اور سعودی عرب میں مقیم پاکستانیوں کے حالات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

طاہرہ اقبال کے اس ناول میں خواتین کردار زیادہ نمایاں، متحرک اور پُر تاثیر دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کی ساری کہانی نسائی کرداروں کے گرد گھومتی ہے اور مصنفہ نے ان کرداروں کو نمایاں کرنے میں خاصی محنت کی ہے۔ ناول میں اگرچہ مرد کردار بھی ہیں جیسے اصغر خان، اکبر خان، عثمان خان، حکم داد، اظہار الحق، مختار، چودھری نذیر، چودھری محمد اکرم اور تاج کی نسب شکیلہ جان، صنوبر جان، محمد جان، میرن، فاطمہ، تائی بختو، رحمت جان، غزل جان، ساریہ جان اور جسبیر کور کے کردار زیادہ مضبوط اور متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ طاہرہ اقبال کا یہ ناول عورتوں کی پکچر گیلری معلوم پڑتا ہے۔ دکھایا یہ گیا ہے کہ مرد کمانے کے لیے دوسرے شہروں کا رخ کرتے ہیں اور یہاں کی خواتین کے حصے میں نہ صرف انتظار لکھ جاتے ہیں بلکہ گھر اور کھیتوں کی تمام تر ذمہ داریاں بھی ان کو نبھانا پڑتی ہیں۔ ناول کا سارا پلاٹ شکیلہ جان، صنوبر جان، جھلی میرن اور غزل جان کے گرد بنا گیا ہے۔

''گراں'' پوٹھوہار کا ایک گاؤں تھا جہاں ضروریات زندگی کی ہر چیز موجود تھی۔ اس علاقے کے لوگ دوسروں پر انحصار نہیں کرتے تھے۔ مختلف کاموں کے لیے مختلف لوگوں نے ذمہ داری اٹھائی ہوئی تھی۔ تمام لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں بھی گاؤں کے اندر ہی کی جاتی تھیں، نہ کسی لڑکی کو بیاہ کر باہر بھیجا جاتا تھا اور نا کوئی باہر سے بیاہ کر لائی جاتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کی عورتوں کی قسمت کا فیصلہ یہاں کے بڑے بزرگ ہی کرتے تھے اور ہر لڑکی کو اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرنا پڑتا تھا۔

بقول ڈاکٹر عبدالعزیز:

> ''اس سماج کی عورت معاشرتی جبر کا شکار تھی جس کے تمام تر فیصلے خاندانی بزرگ کیا کرتے تھے، خاندان کے مردوں سے وفاداری اُس کے لاشعور کا حصہ تھی۔ ایک دفعہ جس سے منسوب کر دی جاتی پھر تمام عمر وہ اسی کی ہو رہتی۔''[۴]

اس گراں کی عورت چاہ کر بھی کچھ اور نہیں سوچ سکتی تھی اُسے پتہ تھا کہ خاندان کے بڑے اُسے جس بھی کھونٹے سے باندھ دیں گے اُسے تا عمر اسی سے بندھے رہنا ہو گا۔ ناول کو پڑھ کر لگتا ہے ہے تمام مرد کردار انتہائی لاپرواہ اور غیر ذمہ دار ہیں کہ اُن کو اپنی خانگی ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہیں ہے۔ یہاں کی عورت وفا کی دیوی ہے وہ نہ صرف اپنے مرد سے وفا کرتی ہے بلکہ اپنے گھر اور بچوں کی تمام تر ذمہ داریوں کو بھی اُٹھائے ہوئے ہے۔ زرینہ جان کا بیٹا انور خان جب خودکشی کر لیتا ہے تو اُس کی بیوی جسے وہ کشمیر سے بیاہ کر لایا تھا، نے اپنے چچیرے سے شادی کر لی۔ یہ اس گاؤں میں مرد سے بیوفائی کی پہلی مثال ہے جس نے گاؤں بھر کی عورتوں کو شرمسار کر دیا تھا۔ گاؤں کی ساری عورتیں یوں محسوس کر رہی تھیں جیسے اُس کشمیرن نے اُن سب کے منہ کالے کر دیئے ہوں۔ یہ وفا تھی یا شرم و حیا کہ اِس گراں کی عورتیں دن کی روشنی میں اپنے شوہر کو دیکھنا بھی بے حیائی خیال کرتی تھیں اور کہاں شوہر کے مرنے کے بعد دوسری شادی۔ یہ تو انور خان کے مرنے سے بھی زیادہ اذیت ناک تھا۔

''ہائے ظلمی! سارے پوٹھوہار میں نہ کبھی سُنا نہ تکا، زنانی جس نام لگی اُسی کی ہو مری۔۔۔ہائے پتہ نہیں انور خانے نے کس حال میں دیکھی کہ آپ ہی کو گولی مار مرا، گولی کے گولی کے لائق تو یہ کنجری تھی۔ ہائے متھے کی کالک۔۔۔ہائے لُچی، لال کُرتی کی کنجری۔۔۔''۵

یہاں کی عورتوں کے لیے یہ عورت نہیں بلکہ عورت کے نام پر ایک دھبہ تھی کیونکہ یہاں کی عورتیں مردوں سے زندگی کی آخری سانس تک وفا کرتی تھیں۔ اب شکیلہ جان کو ہی دیکھ لیں اکبر خان جب فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ بھرتی ہوا تو جانے سے پہلے شکیلہ جان کا نکاح اس سے کر دیا گیا۔ وہ بھرتی ہو کر ایسا گیا کہ پھر کبھی نہ لوٹا اور وہیں کسی افسر کی بیٹی سے شادی کر لی لیکن شکیلہ جان کو ہر روز اس کے آنے کا انتظار ہوتا تھا اور ہر ریل گاڑی کے آنے اور جانے کا حساب رکھتی تھی کہ پتہ نہیں اس کا فوجی کس گاڑی سے اُتر آئے۔ وہ ہر گاڑی کو یہی آس لگائے دیکھتی رہتی۔ حالانکہ شکیلہ جان سے کبھی بھی اس شادی کے لیے نہیں پوچھا گیا تھا اس کی رضا کے بنا ہی بزرگوں نے اس کا نکاح کر دیا تھا پھر بھی وہ اکبر خان کے نکاح کی ڈور میں بندھی رات دن اسی کا انتظار کرتی تھی۔ وہ تو کپڑے دھو کر لوٹی تھی جب مختار نے آ کر بتایا:

''ہائے مری گچھیں پیڑیئے اُٹھ تہواڑ نکاح اے۔''۶

یوں اکبر خان شکیلہ جان سے نکاح کر کے کبھی واپس نہ آنے کے لیے چلا گیا اور اس کے مقدر میں عمر بھر کا انتظار لکھ گیا۔ اب شکیلہ جان جب کسی گاڑی کو دیکھتی ہے تو اس کے دل سے ایک ہی آواز نکلتی ہے۔

''کدمڑ آسو کیہڑی گڈی توں لہسو،''۷

یہ صرف شکیلہ جان کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ یہ گراں کی ہر دوسری عورت کا المیہ تھا۔ مرد غربت ختم کرنے کے لیے آرمی میں چلے جاتے یا پھر دساور کو سدھار جاتے یہاں کی عورتوں کے مقدر میں ان کی زندگی میں انتظار لکھا تھا اور مرنے کے بعد بھی ان کی قبروں سے وفا کرنا لکھا تھا۔ وہ زرینہ جان ہو، جھلی میرن ہو یا امیر جان جس کے نام لگ گئیں عمر بھر اسی کی ہو رہیں اور کسی کی شکل نہ دیکھی۔ زرینہ جان کے شوہر جنگ سے تو زندہ واپس آ گئے تھے لیکن کراچی میں کسی حادثے کا شکار ہو گئے۔ اس کے بعد زرینہ جان نے اپنی جوانی اور بڑھاپا اپنے شوہر کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر گزار دیا۔ جھلی میرن کے شوہر کشمیر کے محاذ پر لڑتے ہوئے شہید ہو گئے مگر اُسے ساری زندگی امید رہی کہ اُس کا صوبے دار عبدل ضرور واپس لوٹ آئے گا۔ وہ خود کو اور دوسروں کو ہمیشہ جھوٹے دلاسے دیتی رہی۔

''اج ہندوستان نی قید اچوں چھٹ آسن، جرنیل صاحبے ناں ٹیلی فون آیا ہے، پیشی ویلے گڈیوں لہسن۔''۸

امیر جان کے پاس اپنے شہید ہونے والے شوہر کی وردی اور اُسے ملنے والے تمغے نشانِ جرأت کے سہارے اپنی زندگی کاٹ رہی تھی۔ رزینہ جان بھرپور جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ کیسے کیسے رشتے نہ آئے زرینہ جان کے لیے لیکن وہ اپنے ارادوں کی پکی تھیں اُن کا خیال تھا کہ عورت جب ایک بار کسی مرد کے لڑ لگ جائے تو عمر بھر اُسی کی ہو کر رہے۔

''یہ تو پوٹھوہار کی ریت ہی نہیں توبہ توبہ! اک واری جیہڑی منگی گئی مرد دیکھا کہ نہ دیکھا بس اسی نام کے لڑ لگ عمر گزار دی۔''۹

زمانہ بدلا تو پوٹھوہار کے لوگ جو پہلے روزگار کے سلسلے میں فوج میں بھرتی ہو کر اپنی خواتین کو انتظار کی سولی پر لٹکائے رکھتے تھے اب اُنہیں مردوں میں کمائی کے لیے بیرون ملک جانے کا رجحان عام ہونے لگا۔اِس گراں کے معاشی حالات بدلنا شروع ہو گئے اور جھونپڑیوں کی جگہ پکے مکان بننے لگے۔گاؤں میں سب سے پہلے جو پکا مکان بنا وہ صوبیدار حکم داد کا تھا جس کا ایک بیٹا میجر تھا جو سعودی عرب میں تعینات تھا اور دوسرا بیٹا اصغر انگلینڈ میں تھا اور وہاں سے ڈالر بھیج رہا تھا جو اُن کی ماں محمد جان بڑا سنبھال کر رکھتی تھی۔

گھر بدل گئے معاشی حالات بدل گئے، اسلام آباد میں بڑے بڑے پلازے بن گئے، دکانیں بن گئیں لاکھوں روپے کی آمدن گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔سب کچھ بدل گیا اگر نہیں بدلے تو گراں کی عورتوں کے حالات نہیں بدلے۔سالوں پہلے بھی انہیں فوج میں جانے والوں کا انتظار کرنا ہوتا تھا اب انہیں پرائے دیس سدھار جانے والوں کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔پہلے بھی تمام حقوق مردوں کو حاصل تھے آج بھی تمام حقوق مردوں کو حاصل ہیں۔اس گراں کی عورتوں کا عقیدہ ہے کہ اچھا پہننا اور کھانا بھی صرف مردوں کا حق ہے عورتوں کو بھلا اچھا کھانے کی کیا ضرورت ہے۔اس لیے پردیس سے لاکھوں روپے کما کر بھیجنے والوں کی بیویوں کو اپنے ہی گھر میں اپنی مرضی سے کچھ کھانے کی اجازت نہیں تھی اور محمد جان ہر چیز کو تالا لگا کر کڑی نگرانی میں رکھتی تھی۔ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف اُن کو ہی کچھ نہیں دیتی اور خود کھاتی ہے بلکہ اُس کا خیال ہے کہ باہر پردیس میں رہ کر کمانے والوں کی کمائی کو یوں اپنے اوپر خرچ کرنا درست نہیں ہے۔اُن کے خیال میں عورت کی ضرورت ہی کیا ہوتی ہے عورت تو پیدا ہی مرد کی خدمت کے لیے ہوئی ہے۔اگر گھر مین مرد نہیں تو کھانا بنانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔محمد جان کے نزدیک مرد کے بغیر عورت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

> ''مرد تو کوئی رہا نہیں گھر میں کس جوگا رِن پکا کے رکھوں۔ہائے کبھی عورتوں نے اس پوٹھوہار میں دودھ چکھے جو اُبال کے رکھوں، گھی شکر مرد کھاتے ہیں کس کے لیے روٹیاں چپڑوں۔۔۔''[۱۰]

زمانہ بدلا تو بہت کچھ بدل گیا جہاں اِس گراں کی عورتوں میں وفاداری مثالی تھی وہاں اب عورتوں میں اپنے حقوق کے لیے بیداری کی ایک لہر بھی اُٹھ رہی تھی۔کہاں تو شکیلہ جان جیسی عورتیں کہ اکبر کے ساتھ نکاح کے چند بول ہے پڑھے گئے تھے کچھ عمر اُن بولوں کے سہارے کاٹ لی اور بعد میں جب اکبر نے اُسے طلاق دے دی تو بھی وہ جب تک زندہ رہی اسی کے نام پر بیٹھی رہی۔ناول پڑھ کے لگتا ہے کہ وہ عورتیں نہیں بلکہ وفا کی دیویاں تھیں۔معاشرے کا اتنا ظلم اور جبر برداشت کرنے کے باوجود شکیلہ جان کے منہ سے اُف تک نہیں نکلا۔اُس نے کبھی اپنے بڑوں کے بارے میں بات نہیں کی۔اپنے اس دکھ کا الزام اُن کے سر نہیں دھرا بلکہ ان حالات میں بھی وہ خود کو ہی کوستی رہیں کہ اس کی وجہ سے خاندان کے بڑوں میں اختلافات پیدا ہوئے۔اگر وہ پیدا ہی نہ ہوتی تو شائد انہیں اِن حالات سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔

صنوبر جان کا تعلق بھی اسی قبیلے سے ہے اور اُس کے مقدروں میں بھی عمر بھر کا انتظار تھا۔اصغر خان جب انگلینڈ جانے لگا تو صوبیدار حکم داد کے حکم سے اُس کا نکاح صنوبر جان سے کر دیا گیا۔اُس وقت تو صنوبر جان بڑی خوش تھی لیکن شادی کے چھ دن بعد ہی اصغر جان اُسے چھوڑ کر انگلینڈ چلا گیا اور پوٹھوہار کی ایک اور نوجوان اور خوبرو لڑکی کے مقدروں میں طویل انتظار لکھ گیا۔صنوبر جان یہ جدائی بھی اچھے دنوں کی امید میں کاٹتی رہی۔اُسے کہاں معلوم تھا کہ یہ جدائی طویل تر ہوتی جائے گی یہاں تک کہ اصغر خان اپنی بیوی تو کیا اپنی بیٹی کو دیکھنے بھی نہیں آئے گا جسے صنوبر جان نے کئی دنوں تک

صرف اس لیے نہ دیکھا کہ وہ اور اصغر جان مل کر دیکھیں گے۔ کچھ عرصہ تو صنوبر جان کو یہ آس رہی کہ اُس کا اصغر خان ایسا نہیں وہ جلد واپس لوٹ آئے گا لیکن گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی یہ آس بھی دم توڑ گئی۔

اصغر خان شادی کے نو سال بعد لوٹا تو اُس کے مزاج میں بلا کی سرد مہری تھی۔ صنوبر جان کو بہت امید تھی کہ وہ آئے گا تو اُس سے بہت ساری باتیں کرے گا کچھ اپنی سنائے گا اور کچھ اُس کی سُنے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ جس آس پر ہجر کا کڑوا گھونٹ پیا وہ لوٹا بھی تو دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے تھے ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اصغر خان لندن میں رہنے کے باوجود اپنی ہی بیوی سے یوں شرماتا تھا کہ ہر وقت راہِ فرار اختیار کرنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا تھا۔ صنوبر جان جس نے یہ نو برس انتظار کی سولی پر اچھے دنوں کے انتظار میں کاٹے تھے دن رات یہی آس لگائے رکھتی کہ کوئی اس کے زخموں پر مرہم رکھنے آئے گا لیکن کوئی نہ آیا۔ اس وجہ سے صنوبر جان کی اذیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

> ''شب بھر ڈھولکی بجتی رہی اور صنوبر جان ولائتی صندوقوں سے بھرے اکیلے کمرے میں انتظار کے دبے قدموں کی آہٹ بن بجتی رہی۔ نو برس کے تنہا حبس میں منہ بند پڑی لاش بو مارنے لگی تھی۔ برف کی سلوں میں لگے زخم گرم آہوں میں پگھلنے لگے تھے۔ خلیہ در خلیہ ٹوٹ پھوٹ جاری تھی۔ سارے عضلات توڑ پھوڑ کا شکار ہو چکے تھے جو پچھلے نو، دس برس رستے رہے تھے لیکن منہ کھولے ہونکتے ہوئے ان زخموں پر پھاہا رکھنے کو کوئی نہ آیا تھا تو کیا آج بھی نہیں۔۔۔۔''[11]

زمانہ بدل رہا تھا ایک طرف پوٹھوہار کے سب نوجوان کمائی کرنے کے لیے دوسرے ملکوں کو سدھار گئے تھے تو دوسری طرف پیچھے رہ جانے والوں کے پاس ہر طرح کی سہولت موجود تھی۔ اب سہولیات کی بہتات کی وجہ سے شہر جانا اور آنا بھی کچھ مشکل نہیں رہا تھا۔ اس لیے نئی نسل کے تمام بچوں کو سکولوں میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ اب ان پڑھ ماؤں کی بیٹیاں اسلام آباد کے بڑے اور مہنگے سکولوں اور کالجوں میں جانے لگیں تھیں۔ تعلیم نے اُن کو شعور اور آگہی دی تو انہیں بھی اپنے حقوق اور پسند و ناپسند کا احساس ہونے لگا۔ عصر حاضر میں پڑھی لکھی نئی نسل نے اپنے خاندان کی عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یوں اُن کے دل میں اپنے ہی خاندان کے مردوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ جس قصبے کی عورتوں کے منہ میں زبان نہیں تھی اُنہیں آج بولنا آ گیا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ اپنی ماؤں کی محرومیوں، اذیتوں، صبر و قناعت، بھوک اور بے بسی کا ازالہ کیا جائے۔

غزل جان جو صنوبر جان اور اصغر خان کی بڑی لڑکی تھی اور اسلام آباد کی کسی یونیورسٹی میں لاء کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ بڑے بھاپا جی جب اپنی بیماری کے باعث مسقط سے لوٹے تو اپنے بیٹے عثمان خاں کا ویزہ بھی ساتھ لیتے آئے۔ اُن کا خیال تھا کہ گاؤں کے باقی نوجوانوں کی طرح عثمان خان کا نکاح کر کے اسے اپنی جگہ باہر بھیج دے گا۔ یہاں کئی دہائیوں سے چلی آ رہی روایت کے مطابق غزل جان کی شادی اس کی مرضی بغیر ہی عثمان خان سے طے کر دی گئی۔ عصر حاضر میں وقت اور حالات سب کچھ بدل چکا تھا لیکن شائد یہاں کے بڑوں کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ نئی نسل اب تعلیم یافتہ ہے اور اپنے اچھے بُرے کے بارے میں بھی اچھی طرح واقف ہے۔ اب وہ بڑوں کے ہر فیصلے کے سامنے خاموشی سے سرِ تسلیم خم نہیں کریں گے۔ جب غزل جان یونیورسٹی سے واپس لوٹی تو اسے اس کی شادی کی خبر سُنا دی گئی۔ اسے یہ خبر سُن کر ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی کہ وہ اَن پڑھ عثمان اس کے مقدر کا ستارہ کیسے بن سکتا ہے یہ سوچ کر اس نے بغاوت کا فیصلہ کر لیا اور شادی سے انکار کر دیا۔

''کیوں بے جی! آپ نے مجھے شکیلہ جان سمجھا کہ پھوپھی فاطمہ یا صنوبر جان۔۔۔۔۔۔بے جی آپ کو سمجھنے میں تھوڑی غلطی لگ گئی میں غزل جان ہوں۔''۱۲؎

اس گاؤں میں غزل جان وہ پہلی لڑکی تھی جس نے سب سے پہلے پرانی اور فرسودہ روایات سے بغاوت کی اور عین شادی والے دن گھر سے نکلی اور سیدھی لندن اپنے باپ کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں جہاں اس کی ماں کبھی نہ جا سکی۔ یہاں اس کی ملاقات جسبیر کور سے ہوئی جو اس کی ماں کی ہی ہم عمر تھی اور اس کی ماں کی نسبت زیادہ صحت مند اور جوان تھی۔ جسبیر کور غزل جان کے باپ کے ساتھ مٹھائی کی دکان میں حصہ دار تھی۔ غزل جان نے جب اسے دیکھا تو اسے لگا کہ اس کی ماں صنوبر جان کی تنہائیوں اور محرومیوں کا ذمہ دار جہاں اس کا باپ ہے وہاں یہ عورت بھی ہے جس نے اُس کے باپ کو یہاں وہ تمام سہولتیں فراہم کر دی تھیں جو اسے اس کی ماں سے مل سکتی تھیں اس لیے کبھی اپنا گھر اور بیوی بچے یاد نہیں آئے۔ غزل جان نے اپنی ماں کو انتظار کی سولی پر لٹکتے دیکھا تھا۔ وہ جس اذیت سے ہر روز گزرتی تھی غزل جان اس سے پوری طرح آشنا تھی۔

''اصغر خان اسے نوخیز، نوبیاہتا چھوڑ کر گیا۔ لوٹا تو آٹھ برس کی بچی کی یژمردہ اور سنجیدہ عورت، اگلی بار جوگی والا پھیرا ڈالا تو نوجوان بیٹیوں کی عمر اُتری ہوئی متفکر ماں۔ وہ عورت جس کے سارے پھل مرجھا چکے تھے، جن کا مالک ایک آدھ منہ مار کر پال میں لگا گیا تھا اور نمک لگی بھوسے کی تہوں میں دبی بہت پکی، خوشبوئیں مہکاریں چوے کے پانیوں اور چٹے پڑ سے اُترتی آبشار میں گھلیں۔ پھر یہ پھل گلنے لگے بو مارنے لگے اور سڑنے لگے۔ مالی کو پال پھرولنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ کتنے میٹھے رسیلے اور قیمتی تھے یہ سارے پھل جو سب ضائع ہوئے۔ وہ تو کسی اور باغیچے کو سینچتا رہا۔''۱۳؎

غزل جان نے لندن میں ہی ایک یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور ساتھ ہی ساتھ جسبیر کور کے ساتھ اس کے کام میں ہاتھ بٹانے لگی۔ اس دوران اس پر انکشاف ہوا کہ جسبیر کور بھی ''گراں'' کی ہی رہنے والی ہے اور وہ اس کی ماں کو بھی اچھی طرح جانتی ہے اور وہ اس کے باپ کو بھائی کہتی ہے اور اس میں کوئی ایسا ویسا رشتہ نہیں ہے تو اس وہم دور ہو گیا۔

یہاں یونیورسٹی جاتے ہوئے اس کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی اور وہ اس کے اظہار محبت سے متاثر بھی ہوئی لیکن اُس کی مغرب زدہ سوچ میں اس کا ساتھ نہ دے سکی۔ وہ لاکھ پڑھی لکھی آزاد خیال سہی لیکن اس کا خمیر تو اسی ''گراں'' کی مٹی سے اٹھا تھا نہ جہاں عورت شرم وحیا کی دیوی تھی۔ اس نے کئی برس لندن میں گزارے پھر جب اسے شکیلہ جان کے مرنے کی اطلاع ملی تو وہ رک نہ سکی اور واپس اپنے گاؤں اس کے افسوس کے لیے آ گئی۔ اس دوران اسے تاج کی دھرتی کے باسی کی یاد بھی آئی جو اس کے رویے میں تلخی گھول گئی اِدھر عثمان جو سب کو کھانا کھلا رہا تھا غزل جان سے یوں شرمندہ تھا جیسے شادی وہ چھوڑ کر بھاگا تھا۔ غزل جان کو یہ دیکھ کر ایک عجیب احساس تفاخر ہوا اور اس نے عثمان سے شادی کرنے مین رضامندی ظاہر کر دی۔ یہ شادی نہیں تھی بلکہ مردوں کے سماج سے بدلہ لینے کا ایک انداز تھا وہ زرینہ جان، شکیلہ جان اور فاطمہ کے دکھوں اور اذیتوں کا بدلہ عثمان سے لینا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جیسے اس کے خاندان کی ساری عورتیں مردوں کے تابع رہیں اس طرح عثمان بھی اس کے تابع رہے گا۔ اُس کی یہ خواہش شادی کی پہلی رات ہی پوری ہو گئی اور باقی کی ساری زندگی عثمان خان نے غزل جان کی مرضی سے گزاری۔

مصنفہ نے ناول میں خواتین کرداروں کو وہ اہمیت دی ہے کہ مرد کردار ضمنی کردار نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ یہ ناول لکھا ہی صرف اُن خواتین کے لیے گیا ہے کہ ماضی میں ان کو کن کن اذیتوں سے گزرنا پڑا۔ ناول کے شروع کے ایک باب میں زرینہ جان، شکیلہ جان، جھلی میرن اور فاطمہ کا تذکرہ ملتا ہے اور تیسرے بات سے غزل جان کی کہانی شروع ہو جاتی ہے اور ناول کے اختتام تک اسی کا ہی تذکرہ ہے۔ وہ شادی سے پہلے بھی کافی عرصہ لندن میں اپنے باپ کے پاس رہی لیکن مصنفہ نے کہیں بھی اس کے باپ کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ غزل جان کے وہاں جانے پر اس کا کیا ردعمل تھا یا وہاں رہتے ہوئے اس کا اپنی بیٹی کے ساتھ کیا رویہ تھا کہیں ذکر نہیں۔ شادی کے بعد وہ ایک بار پھر لندن چلی گئی جہاں عثمان کا کہیں کہیں تذکرہ ملتا ہے کہ وہ ٹیکسی چلاتا تھا لیکن اس کے باپ کا پھر بھی کہیں کوئی ذکر نہیں۔ شائد غزل جان کو مرد سماج سے اس قدر نفرت ہو گئی تھی کہ وہ عثمان خان کے ساتھ رہ کر بھی کبھی اس سے محبت نہ کر سکی بلکہ دونوں دن کے اُجالے میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تک نہیں تھے۔ غزل جان نے اگرچہ سماج سے بغاوت کی لیکن پھر بھی اسی جبر کا شکار ہوئی اور آخر کار وہ بھی زرینہ جان کی طرح عثمان خان کی قبر پر مجاور بن کر بیٹھ گئی۔

سماجی اور اسلوبیاتی حوالے سے ''گراں'' اردو ناول نگاری میں قابل قدر اضافہ ہے۔ پوٹھوہار کی تہذیب اور زبان جس خوبصورت انداز میں بیان کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ طاہرہ اقبال نے پوٹھوہاری الفاظ اور روزمرہ گفتگو میں بولے جانے والے محاورات کو جس برجستگی سے کہانی کا حصہ بنایا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ''گراں'' میں تانیثیت کے عناصر بھی بہت نمایاں ہیں۔ عورتوں پر ہونے والے مظالم کے ساتھ ساتھ ان کی محنت مشقت ، روزمرہ زندگی کی ضروریات، مردوں کے شانہ بشانہ کھیتوں میں کام کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ گھر داری اور بچوں کی دیکھ بھال بھی عورت کے ہی ذمہ ہے۔ عورت کی نفساتی عکاسی بھی ''گراں'' کو تانیثی ادب میں نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔ خاوند کے انتظار میں پوٹھوہاری عورت ہجر کی آگ میں پل پل جلتی ہے مگر حرف شکایت زبان پر نہیں لاسکتی۔ اس عورت کے احساسات وجذبات کو طاہرہ اقبال نے جس جاندار انداز میں زبان عطا کی ہے وہ اس ناول کو خواتین کا نمائندہ ناول بنا دیتی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ سماجی، اسلوبیاتی، ثقافتی اور تانیثی حوالے سے ''گراں'' کو اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

حوالہ جات

ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، متن، سیاق اور تناظر، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۲ء)، ص ۹۱

ہارون انیس، فیمینزم اور پاکستانی عورت، مشمولہ: فیمینزم اور ہم، (کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء)، مرتبہ: فاطمہ حسن، ص ۱۲

عقیلہ جاوید، اردو ناول مین تانیثیت، (ملتان: بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء)، ص ۵۵

https://khayyalnama.com/tanqeed/

طاہرہ اقبال، گراں، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ص ۴۸

ایضاً ص ۳۸

ایضاً ص ۵۳

ایضاً ص ۸۱

ایضاً ص ۲۶

ایضاً	ص۶۹
ایضاً	ص۷۶
ایضاً	ص۹۲
ایضاً	ص۱۱۵